

بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟

بدگمانی عربی کے لفظ 'الظن' کا ترجمہ ہے۔ عربی کا 'ظن' اچھے اور برے دونوں معنی میں آتا ہے۔ جس طرح اردو میں گمان دونوں معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بدگمانی سے روکا گیا ہے، وہاں 'سوء الظن' کے بجائے صرف 'ظن' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ، إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ...
”اے ایمان والو، کثرت گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں...“
(الحجرات ۱۲:۴۹)

اصل حکم

اوپر مذکور آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن مجید نے محض بدگمانی سے نہیں روکا، بلکہ اس نے کثرت گمان سے روکا ہے۔ یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بات سے روکا ہے کہ ہم خواہ مخواہ دوسروں کے بارے میں ظنون تراشتے رہیں۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات بالکل متعین ہے کہ یہاں جن گمانوں کی بات ہو رہی ہے، وہ لوگوں ہی سے متعلق

ہیں۔ یعنی اخلاقی دائرے میں آنے والے گمان۔ انھی کی کثرت بری چیز ہے۔ چونکہ یہ اخلاقیات سے متعلق ہے۔ اس لیے اخلاقیات میں ہر خرابی اسلام کے نزدیک برائی ہے، اور وہ ایک قابل مواخذہ جرم ہے۔

گویا لوگوں کے بارے میں ہمیں اصل میں ان ہی کے عمل و نظریہ کی بنیاد پر رائے بنانی چاہیے۔ ان کے بارے میں ہماری رائے نہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہونی چاہیے اور نہ ہمارے بے بنیاد خیالات پر، جو بلا دلیل ہمارے دل میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ہمارے وہ خیالات جن کی بنیاد محض ہمارا گمان ہو، درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تابیر نخل میں اپنی ایک رائے کے بارے میں فرمایا تھا:

فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، وَإِنَّ الظَّنَّ يُخْطِئُ
وَيُصِيبُ. (ابن ماجہ، رقم ۲۵۶۲)
”بھئی میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں، وہ میرا
ایک خیال (گمان) تھا، اور خیالات صحیح بھی ہو جاتے
ہیں اور غلط بھی۔“

گمانوں کی کثرت سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں خطا کا امکان ہے۔ اگر ہمارا گمان صحیح بھی ہے تب بھی اس میں یہ خرابی ضرور موجود ہے کہ وہ ہمارا گمان ہے، کسی ٹھوس شاہد و دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ بندہ مومن کو اپنی آرا کو حتی الامکان ٹھوس چیزوں پر مبنی کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ، إِنَّ
السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ
كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا. (بنی اسرائیل ۳۶:۱)
”اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں، اس کے درپے نہ ہو
کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز سے پرسش
ہونی ہے۔“

قرآن کی رو سے اس ضمن میں اصلاً مطلوب یہی ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں کسی قسم کی ایسی آرا نہ بنائیں، جن کی ہمارے پاس ٹھوس بنیاد (علم) موجود نہ ہو۔

گمانوں پر مواخذہ

قرآن مجید نے گمانوں کو قابل مواخذہ قرار دیا ہے۔ گمان کئی پہلوؤں سے قابل مواخذہ ہو سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں چند اہم چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے، جو ہمارے گمانوں کی وجہ سے انجانے میں ہم سے سرزد ہو جاتی ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو گمان کو گناہ بنا دیتی ہیں:

بے بنیاد خیال

بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایسی آرا بنانے پر ہماری پرسش ہوگی، جن کے پیچھے کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوگی، بلکہ وہ محض ہمارے خیال اور گمان پر مبنی ہوگی۔ قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ ہماری پرسش آنکھ، کان اور دلوں سے بھی ہوگی (۳۶:۱۷)۔ جس آنکھ نے غلط دیکھا، اور جس کان نے غلط سنا، اور جس دل نے غلط سوچا وہ مجرم ہے وہ پکڑا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلط اور بے بنیاد آرا پر ہماری پکڑ ہوگی۔ اس لیے کہ بغیر کسی دلیل کے کسی کے بارے میں برا سوچنا ایک غلطی ہے۔ اس لیے اس غلطی پر بھی باز پرس ہوگی۔

چونکہ ہمارے گمان بے بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے ہم یہ نہیں جان سکتے کہ کون سا گمان گناہ والا ہے اور کون سا نہیں۔ یعنی جب ہمیں حقیقت کا علم ہوگا تو تبھی پتا چلے گا کہ ہم غلط سوچ رہے تھے یا ٹھیک۔ اس لیے حقیقت کے سامنے آنے تک ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ہم غلط سوچ رہے ہیں یا صحیح۔ اسی لیے قرآن مجید نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ بدگمانی کو ترک کرو، بلکہ اس نے کہا کہ بہت گمان نہ کیا کرو۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر غلط ہی ہوں گے۔

بعض شارحین نے یہ بات کہی ہے کہ جو گمان اتہام اور بہتان کی شکل اختیار کر جائے وہ گمان گناہ ہے۔ لیکن قرآن نے یہ بات نہیں کہی۔ قرآن نے تو گمانوں میں سے بہت سے گمانوں کو گناہ قرار دیا ہے۔ محض اس لیے کہ وہ بلا دلیل بنائے گئے ہیں۔

نا انصافی

گمانوں کے مواخذہ کی بڑی وجہ ان کے ہمارے رویوں پر اثرات ہیں۔ اسی طرح گمانوں کی وجہ سے ہم ایسے عمل کر ڈالتے ہیں جو برے ہوتے ہیں۔ ان اعمال میں سب سے بڑا عمل نا انصافی ہے۔ قرآن مجید کا وہ حکم جو سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گمان اور خیالات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ شیطانی وسوسے اور ادھر ادھر کے خیالات دل میں آتے رہتے ہیں۔ اگر ہم انھی خیالات پر جم گئے اور گمانوں پر ہی اپنے کسی بھائی کے بارے میں بری رائے بنالی تو وہ گناہ کا باعث ہے۔ لیکن اگر وہ گمان ہمارے دل میں آیا، اور ہم اس میں مبتلا ہونے کے بجائے اس سے نکل گئے اور اس کو رد کر دیا تو ہم گناہ سے بچ گئے۔ اس لیے کہ کسی کے بارے میں بری یا محض غلط رائے بنالینا اس کے ساتھ نا انصافی ہے۔ مثلاً آپ نیک نیتی سے کوئی عمل کریں، تو اس پر کوئی آدمی دل ہی دل میں یہ رائے بنا لے کہ آپ ریاکار ہیں تو کیا یہ آپ کے ساتھ انصاف ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ انصاف نہیں

ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے یہ گمان گناہ بن جاتے ہیں۔

تعلقات پر برے اثرات

گمانوں سے ہونے والا دوسرا بڑا عمل ہمارے تعلقات میں خرابی ہے۔ ہمارے تعلقات میں اہم چیز ہماری رائے ہوتی ہے۔ یعنی اگر کسی کے بارے میں ہماری رائے اچھی ہوگی تو ہم اس کو اچھے طریقے سے ملیں گے اور اگر ہماری رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں ہوگی۔ تو ہم اچھے طریقے سے نہیں مل سکیں گے۔ اس طرح سے ہمارے گمان ہمارے رویوں کو خراب کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے گمان ہی کی بنا پر دوسرے سے معاملات کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس سے وہ گناہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

یعنی اگر ایک آدمی نے برائی نہیں کی، مگر ہم نے گمان ہی گمان میں اس کو مجرم بنا لیا ہے تو اب اس کے ساتھ ہمارا رویہ بگڑ جائے گا، جو بلا وجہ ہوگا۔ برے رویے کی بنا پر ہم گناہ مول لے لیتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھیں تو محض گمان بھی دراصل ان گناہوں میں سے ایک ہے، جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ تمہیں شعور بھی نہیں ہوتا، مگر وہ تمہارے اعمال کو ہڑپ کر جاتے ہیں (الحجرات ۲۹:۴)۔

نیتوں کا تعین

گمان بالعموم نیت کا تعین بن جاتے ہیں۔ ہمارے تمام گمان جن کو ہم بدگمانی کہہ سکتے ہیں، ان کی نوعیت بالعموم یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے بھائی کی نیت کا تعین کرنے لگ جاتے ہیں کہ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ مجھے تنگ کرنا چاہتا تھا، وہ سب کے سامنے مجھے ذلیل کرنا چاہتا تھا وغیرہ۔

نیتوں کے بارے میں ہم جان ہی نہیں سکتے۔ اس لیے اس کا تعین ایک غلطی ہے۔ جو غلطی اخلاقی دائرے میں ہوتی ہے، وہ گناہ ہے۔ اس پر قیامت کے دن مواخذہ ہوگا۔

اس کی بہت عمدہ مثال وہ واقعہ ہے جو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو پیش آیا جب انہوں نے ایک جنگ میں کسی آدمی کو کلمہ پڑھنے کے باوجود مار ڈالا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ چنانچہ جب ان سے بات ہوئی تو آپ نے فرمایا: 'أَقَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَقَتْلَتَهُ'، 'کیا اس نے لا الہ پڑھا اور پھر بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟' حضرت اسامہ نے عرض کی: 'یا رسول اللہ انما قالها خوفا من السلاح'، 'اس نے ایسا صرف اسلحہ

کے ڈر سے کہا تھا۔“

آپ نے فرمایا: 'افلا شققت عن قلبه حتى تعلم اقالها ام لا'، "تم نے اس کا سینہ چیر لیا ہوتا کہ تم جان لیتے کہ اس نے کلمہ اسلام دل سے کہا یا نہیں!"

حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار یہ جملہ دہراتے رہے، اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا اور یہ غلطی مجھ سے صادر نہ ہوئی ہوتی۔ (مسلم، رقم ۹۶)

یہ حضرت اسامہ کا ایک گمان تھا، نا معلوم صحیح تھا یا غلط؟ لیکن انھوں نے اس کی غلط نیت طے کی اور اس کے خلاف جان لینے تک کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ نیت کا تعین بھی ایک برائی ہے۔ جو ہمیں بہت سنگین عمل تک لے جاسکتی ہے۔

گمان جھوٹ ہوتا ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گمانوں سے بچو اس لیے کہ گمان اکذب الحدیث ہوتے ہیں۔ یعنی بے بنیاد اور جھوٹی بات۔ اس سے بھی اس کے اثم ہوئے کی طرف اشارہ نکلتا ہے، یعنی چونکہ یہ جھوٹی بات ہے، جو انسان دل ہی دل میں سوچ لیتا ہے۔ اور یہ واضح سی بات ہے کہ جھوٹی بات پر قیام بندہ مومن کے لیے صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ گناہ اور برائی ہے۔

غلطی میں اضافہ

ہم اپنے گمانوں کی مدد سے کبھی تو بے گناہ کو گناہ گار بنا رہے ہوتے ہیں، اور کبھی کم خطا و ارکوز یادہ بڑی غلطی کا مجرم ٹھہرا رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی سے غلطی محض بے احتیاطی کی وجہ سے ہوئی ہو، مگر ہم اسے یہ خیال کر کے کہ اس نے ہماری دشمنی میں ایسا کیا ہے۔ اس کے جرم کی سنگینی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

چنانچہ بعض اوقات اپنی ہی چیز اٹھانے والے کو ہم چور سمجھ لیتے ہیں۔ غلطی سے برائی کر جانے والے کو مجرم بنا ڈالتے ہیں۔

سچا گمان غیر ثابت شدہ حقیقت

کوئی شخص یہاں یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اگر آدمی گمان کرے، اور وہ غلط نہ ہو، تو وہ تو گناہ گار نہیں ہوگا۔ تو کیا یہ

ضروری ہے کہ کثرت گمان پر پھر بھی گناہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ گمان سچا بھی ہو تب بھی وہ گمان ہے۔ وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے اس پر قائم رہنا، یا اس کے مطابق عمل کرنا دراصل غیر ثابت شدہ باتوں پر عمل کرنا ہے۔ اس میں اور سنی سنائی باتوں میں پھر فرق کیا رہ گیا؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو تو اس گمان کے سچا ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ تو محض گمان پر کھڑے ہیں۔ جو ایک کمزور اور غلط جگہ ہے۔ ایک گمان کے سچا اور جھوٹا ہونے کے برابر امکانات ہوتے ہیں۔ اس لیے گمان کرنا اور اسے دل میں پالنا ہر صورت میں ایک غلط کام ہے۔

دوبارہ نظر

ہم نے اوپر کی بحث میں یہ بات جانی ہے کہ کثرت گمان سے قرآن مجید نے روکا ہے۔ اس لیے کہ گمان ایک بے بنیاد اور جھوٹی بات ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو وہ ثابت شدہ نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں گمان کرنا اخلاق سے گرا ہوا عمل ہے۔ دین اسلام میں اخلاقی خرابی کو گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس پر مواخذہ ہوگا۔ 'ظن' دراصل جھوٹ، نا انصافی اور نیتوں کے تعین وغیرہ کا نام ہے۔ یہ برے اخلاق کو جنم دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک واضح برائی ہے۔

گمانوں کی کثرت بذات خود نا پسندیدہ چیز ہے۔ اس لیے کہ بندہ مومن گمانوں اور خیالات پر نہیں جیتا، بلکہ اس کی زندگی ٹھوس حقائق پر استوار ہونی چاہیے اور لوگوں کے بارے میں اسے سیدھی اور ثابت شدہ بات پر قائم ہونا چاہیے۔

حسن ظن کا حکم

ہم مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنے بہن بھائیوں، ہم سایوں، دوستوں اور ارد گرد رہنے والوں کے بارے میں حسن ظن رکھیں۔ سورہ نور کی آیت افک سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ہماری عمومی رائے دوسروں کے بارے میں اچھی ہونی چاہیے، جب تک کہ وہ ٹھوس دلائل سے بدل نہ جائے۔ اچھی رائے سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی برائی کسی آدمی سے متعلق آپ کے علم میں آئے تو فوراً:

۱۔ اس کو اچھے پہلو سے دیکھیں۔

۲۔ اس کے اچھے اسباب اور وجوہ پر نظر رکھیں۔

۳۔ جس پر الزام لگایا جا رہا ہے، اس پر الزام لگانے سے گریز کریں اور کہیں کہ ہم نے ایسا کرتے اسے نہیں دیکھا، بخدا ہماری نظر میں پاک صاف ہے۔

حسن ظن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اس کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے قائم کریں۔ بلکہ یہ ہیں کہ اس کے عمل کو بری نظر اور بری توجیہ کر کے نہ دیکھیں، اور نہ محض سن کر یا اپنے گمانوں کی وجہ سے اس پر برائی کا الزام لگائیں۔ کسی کی برائی سن کر فوراً برأت کا اظہار کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب سیدہ عائشہ پر الزام لگا تو قرآن مجید نے مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ ان پر لازم تھا کہ وہ سیدہ عائشہ کی برأت اور پاک دامنی کا اعلان کرتے اس لیے کہ ان میں سے کسی نے بھی انھیں کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ چاہیے یہ تھا کہ سب یک زبان کہتے کہ حاشا وہ پاک دامن اور معصوم ہیں۔ ہم نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ قرآن مجید میں یہ بات یوں آئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم، بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، لِّكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ، وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ. لَوْ لَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِنَفْسِهِمْ خَيْرًا، وَقَالُوا: هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ. (النور ۲۴: ۱۲)

”جو لوگ یہ اتہام گھڑ کر لائے، وہ تم ہی میں سے ہیں۔ تم اس چیز کو اپنے لیے برا خیال نہ کرو، یہ تمہارے لیے اچھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں پڑا، اور جو اس فتنہ کا بڑا حصہ دار ہے، اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔ اے مسلمانو، ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مومن عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی بابت اچھا گمان کرتے، اور

کہتے کہ یہ تو ایک سیدھا سیدھا بہتان ہے۔“

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ ایسی سنگین صورت میں بھی ہمارا کام یہی ہونا چاہیے کہ جب ایک پورا گروہ یہ کہہ رہا ہو کہ فلاں شخص نے ایسا کیا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے اپنے بھائی اور بہن کے بارے میں اچھا گمان رکھیں اور اسے ایک بہتان سمجھیں۔

یہاں اس واقعہ افک کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں جب غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر بعض منافقین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت دھری۔ بظاہر سیدہ کے پیچھے رہ جانے کے باوصف ایک ایسا قرینہ پیدا ہو گیا تھا کہ تہمت میں سچ کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن ایسے قرآن بھی قرآن کے نزدیک بے معنی ہیں۔ اس لیے کہ پیچھے رہ جانے کا ہرگز

مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یقیناً ایسا ہوا ہوگا جیسی ان پر تہمت لگائی جا رہی تھی۔

ہمارا باہمی رشتہ اور بدگمانی

اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے بھائی بھائی بن کر رہیں۔ اس کے لیے اس نے ہمارے تین رشتے بتائے ہیں:

ایک خدا کی مخلوق

ہمارا آپس میں پہلا رشتہ یہ ہے کہ ہم سب کو مختلف خداؤں نے نہیں، بلکہ ایک ہی خدا نے بنایا ہے۔ ہم اس اعتبار سے خدا شریک بھائی ہیں۔ اس نظریہ سے ہمارے رشتے میں برابری کا ایک تصور آتا ہے۔ اگر مجھے کسی اور خدا نے بنایا ہو اور آپ کو کسی اور نے تو ہو سکتا ہے میرے اور آپ میں تفاوت ہو۔ اگر میرا خدا کمزور ہو اور آپ کا قوی تو میں آپ کے مقابلے میں حقیر ٹھہروں گا۔ لیکن اگر میرا اور آپ کا خدا ایک ہے۔ تو مجھ میں اور آپ میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

۱۔ اس تفاوت کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا اور آپ کا منبع و ماخذ ایک ہے۔ جس جگہ سے آپ آئے ہیں میں بھی وہیں سے آیا ہوں۔ جس خدا نے آپ کو بنایا ہے اسی نے مجھ کو۔ آپ کو مجھ پر اور مجھے آپ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

۲۔ میری اور آپ کی فطرت ایک ہی خدا نے بنائی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری سرشت میں تو برائی رکھ دی گئی ہو، اور آپ کی سرشت میں نیکی۔ میرے اندر بھی ضمیر اور نفس کی کش مکش لگی ہے اور آپ کے اندر بھی۔ اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ برائی پر آمادہ رہوں اور آپ ہمیشہ نیکی پر۔ جس طرح آپ کی نیت صحیح ہوتی ہے، اسی طرح میری بھی صحیح ہوتی ہے۔ جس طرح آپ کبھی نفس کا شکار ہو جاتے ہیں اسی طرح میں بھی ہو جاتا ہوں۔ یہ سب ہمارے خدا نے اس لیے بنایا ہے کہ وہ ہمیں آزمائے۔

۳۔ میری اور آپ کی عزت یکساں ہے۔ میں جس جل جلالہ کی تخلیق ہوں آپ بھی اسی کی تخلیق ہیں۔ فلاں اور فلاں کو بھی اسی نے بنایا ہے۔ جو آپ کا مقام ہے، وہی میرا ہے وہی سب کا ہے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۴۔ اس تفاوت کے نہ ہونے کے معنی یہ بھی ہیں کہ میرا اور آپ کا خدا ایک ہے۔ وہی میرا نگہبان اور آپ کا بھی۔

میں بھی اسی کے سامنے جواب دہ ہوں اور آپ بھی۔ اگر آپ مجھ پر ظلم کریں گے تو وہ چونکہ میرا بھی رب ہے اس لیے وہ میرے اوپر ہونے والے ظلم کے تدارک کے لیے آپ کو پوچھے گا۔ اگر میں نے آپ پر ظلم کیا تو وہ آپ کی دادرسی کے لیے مجھ سے پوچھے گا۔ کسی کا یا را نہیں ہے کہ وہاں وہ خدا کی مخلوق پر ظلم کرے، اور کوئی دوسرا (خدا) آکر چھڑالے جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اتنا ہی طاقت ور خدا موجود ہو۔

ایک ماں باپ کی اولاد

دوسرا رشتہ قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں بسنے والے سب لوگ آدم و حوا کی اولاد ہیں، اور ان دونوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ اس اعتبار سے ہم ایک ہی نفس واحدہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ہم آپس میں نسبی اور رحمی تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ اب یہ تعلق دور کا تعلق ہے، لیکن ہماری رگوں میں اب بھی آدم و حوا ہی کا خون دوڑتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
مِّنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً.
”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو
پیدا کیا ایک ہی جان سے، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا
کیا، اور پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں
(النساء: ۱)

اس تعلق سے کچھ نتائج نکلتے ہیں:

ایک یہ کہ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، اس لیے نسلی اعتبار سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔
دوسرے یہ کہ ذاتیں، قبائل اور اقوام محض پہچان اور تعارف کی چیز ہے۔ ان میں بہتر اور کہتر ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔

ملت واحدہ

اسلام میں داخل ہونے والوں کا باہم ایک رشتہ اور بڑھ جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم سب دینی لحاظ سے بھی بھائی بھائی ہیں۔ ”ان المومنون اخوة“ (سب مسلمان بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم اسی تعلق کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تینوں تعلق ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ہم باہم خلوص و محبت، عزت و احترام، ہم دردی و مرحمت، شفقت و عنایت، مدد و نصرت اور باہمی اصلاح و خیر خواہی کے تعلق کے ساتھ برکتوں والا گھر بسا کر اور ایک خیر و امن والا معاشرہ بنا کر رہیں۔ قرآن مجید نے ہمیں اس پہلو سے بہت سی تعلیمات دی ہیں۔ اسی تعلق سے امت مسلمہ میں اتحاد و یگانگت پیدا ہوتی ہے، اسی سے یک جہتی اور اپنائیت وجود میں آتی ہے۔ اسی سے فرقے مکاتب فکر میں تبدیل ہو کر محض علمی اختلاف تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اسی صورت میں حدیث کے مطابق اختلاف اللہ کی رحمت بنتا ہے۔

اس ہمہ جہت محبت و یگانگت کے اس تعلق کو قرآن فروغ دینا چاہتا ہے، تاکہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک تعلق و ارتباط اور محبت و مرحمت کی بنا پر وجود پزیر ہو۔ اور وہ چاہتا ہے کہ مسلمان ان چیزوں سے بچے رہیں، جو اس تعلق کو توڑتی اور باہم تفریق پیدا کرتی ہیں۔ ایسی چیزوں کا قرآن مجید نے سورہ الحجرات میں بالخصوص ذکر کیا ہے۔ جس میں مذاق اڑانا، چغلی و غیبت کرنا، تجسس کرنا، برے نام رکھنا، الزام تراشنا، ذات پات کی تفریق کرنا جیسے اخلاق رذیلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھی میں ایک چیز گمانوں کی کثرت کا حکم ہے۔ یہ سب چیزیں ہمارے اندر تفریق اور جدائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹتی ہیں۔ دلوں میں کدورتیں اور نفرتیں پیدا کرتی ہیں۔ جس معاشرے میں یہ چیزیں عام ہو جائیں وہاں سے بھائی چارہ، محبت اور بالآخر قومی و ملی یک جہتی دم توڑ جاتی ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ گمانوں کی کثرت سے نقصانات کیوں کرو جود میں آتے ہیں۔

گمان کے نقصانات

جب ہمیں کسی کے کسی قول و فعل کی حقیقت جانے بغیر اپنے گمانوں کی بنا پر کچھ بے بنیاد خیالات بناتے ہیں، تو ہم اصل میں اپنی رائے اس کے بارے میں تبدیل کرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہم اپنی رائے کو اس کے بارے میں خراب کر لیتے ہیں۔ جس سے کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن میں سے چند اہم چیزوں کا ہم ذیل میں ذکر کریں گے۔

دل میں میل آنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس آ کر دوسروں کی برائی کرنے والوں کو یہ کہہ کر برائی کرنے سے منع کر دیا

کہ:

لا یبلغنی احد من اصحابی عن احد
شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم وانا
سلیم الصدر۔ (ابوداؤد، رقم ۴۸۶۲)
”مجھے میرے ساتھیوں میں سے کوئی کسی کے بارے
میں کوئی بات نہ پہنچائے اس لیے کہ میں یہ پسند کرتا
ہوں کہ جب میں تم لوگوں میں آؤں تو میرا دل تم
لوگوں کے بارے میں صاف ہو“

دوسروں کی برائی سے جس طرح دل میں میل آتا ہے، اسی طرح اپنے خیالات سے بھی دل میں میل آتا ہے۔
اس میل کے آنے سے ہمارے رویوں میں تبدیلی آتی ہے۔ کسی خیال سے دل میں غصہ پیدا ہوگا، کسی سے نفرت، کسی
سے بے جا اور غیر متوازن محبت۔ یہ سب چیزیں خرابی پیدا کرتی ہیں۔ اچھے رویے کے اظہار کے لیے سب سے پہلی
چیز ہی یہ ہے کہ ہمارا دل دوسروں کے بارے میں صاف ہو، ہم اسی صورت میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر سکیں
گے۔ گمانوں کا یہ نتیجہ بھی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، گمانوں کو قابل مواخذہ بنا دیتا ہے۔ گمانوں سے آنے والا
میل دل میں کدورتوں کو وجود بخشتا ہے، جس سے درج ذیل تعلقات میں تعطل اور خرابی آتی ہے:

۱۔ محبت

ایک دوسرے کے بارے میں گمانوں کی کثرت سے دل دوسروں کے بارے میں صاف نہیں رہتے، جس سے
باہم فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے باہمی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ باہمی تعلق اتنا
کمزور پڑ جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ و درد میں شریک ہونا تو درکنار ان کے ساتھ محض وہ تعلق بھی نہیں رہتا جو ایک
اجنبی انسان کا دوسرے اجنبی انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔

دل میں دوسروں کے بارے میں خرابی تعلقات کے کاٹنے کے لیے ایک کھاڑا ہے۔ اگر آپ کسی کے بارے
میں رائے بگاڑتے چلے جائیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے دل میں اس کی محبت باقی رہے۔ اگر آپ دل کی صفائی کا
اہتمام نہیں کرتے، تو یاد رکھیے کہ ماں باپ جیسے عزیز اور بیوی بچوں جیسے قریبی تعلق میں بھی دراڑیں آ جاتی ہیں اور
بسا اوقات نوبت قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ محبت کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو دوسروں
کے بارے میں بینات اور واضح حقائق پر استوار کریں۔

میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے کہ بعض ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی کہ جو محض خدا کے بارے میں اپنے
خیالات ہی کی وجہ سے اللہ سے نالاں اور اس کے منکر تھے۔ ایسے ہی لوگوں سے ملاقات کے بعد میں نے ”ہم پر

مشکلیں کیوں آتی ہیں، نامی کتاب لکھی۔ تاکہ ایسے بہت سے لوگوں کے دل میں خدا کے بارے میں خلیجان دور ہو۔ اس لیے کہ یہ چیز خدا کے ساتھ محبت کو برباد کرنے والی ہے۔ اور خدا کے بارے میں محبت اور اپنائیت سے محرومی کفر و زندیقی اور الحاد تک پہنچ جاتی ہے۔

میری مراد یہ ہے کہ محبت کا یہ تعلق انسانوں کے ساتھ تو گمانوں کی وجہ سے ٹوٹتا ہی ہے، خدا کے ساتھ ہمارا تعلق بھی برے گمانوں سے ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے حسن ظن کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

۲۔ بھائی چارہ

یہ انسان کا انسان سے وہ رشتہ ہے جو اولاد آدم ہونے کی بنا پر وجود میں آتا ہے اگر ہم محبت سے محروم ہو چکے ہوں تو ہمارا یہ رشتہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے۔ ہماری باہمی کدورتیں اور باہمی عناد ہمیں دوسروں کی مدد کرنے، ان کے کام آنے، ان کی غم و خوشی میں پوری طرح شریک ہونے سے روکے گا۔ ہم ایک ہی محلے اور معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں، مگر تعلقات میں محبت نہ ہونے اور دلوں میں فاصلوں کی وجہ سے کسی کے نہایت مشکل اور نازک موقع پر بھی اس کے پاس سے بے پروائی سے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم گمانوں کی وجہ سے اس مجبور اور بے کس کے خلاف اپنی رائے خراب کر چکے ہوتے ہیں۔

۳۔ مرحمت (ہم دردی)

باہمی محبت کی یہ کمی ہمارے اندر سے ہم دردی کا عنصر بھی ختم کر دیتی ہے۔ ہمارے جیسا انسان ہی بھوکا ہوتا، مرض سے کراہ رہا ہوتا ہے، مگر ہمارے دل میں کوئی خیال تک نہیں رہتا کہ ہم اس کے کام آئیں، اس کی مدد کریں۔ یہ محض اسی موقع پر ہوگا جب ہماری اس کے بارے میں رائے خراب ہوگی۔ دوسروں سے ہم دردی نہ صرف ہمارا اخلاقی وجود تقاضا کرتا ہے، بلکہ ہمارا دینی وجود بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ ہمارا دوسروں پر اور دوسروں کا ہم پر حق ہے:

”ہم نے کیا اس کو دو آنکھیں نہیں دیں (کہ محتاجوں کو دیکھتا)، اور زبان اور ہونٹ نہیں دیے (کہ ان کی مدد کی ترغیب دیتا)، اور دونوں راستے نہیں بھٹائے (کہ اچھے برے کو سمجھتا؟ پر اس نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا) اور وہ گھائی پر نہیں چڑھا، اور تم کیا سمجھے	أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ. وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ. وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ. فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَا أَذْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ: فَكُ رَقَبَةً. أَوْ اطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ. يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ. أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ. ثُمَّ كَانَ
--	--

مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. (البلد ۹۰: ۸-۱۷)

کہ وہ گھائی کیا ہے؟ (یہی کہ) گردن چھڑائی جائے،
اور بھوک کے دن کسی قریبی یتیم یا کسی بے حال مسکین
کو کھانا کھلایا جائے۔ پھر آدمی ان میں سے ہو جو
ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو ثابت قدمی
کی اور دوسروں سے ہم دردی کی نصیحت کی۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں، ناداروں اور رشتہ دار ضرورت مندوں کے کام آنا، ان پر اپنے مال میں
سے خرچ کرنا کتنا ضروری ہے۔ مگر بہت ساری وجوہات ہمیں اس سے روک دیتی ہیں۔ ان وجوہات میں سے ایک
بدگمانی بھی ہے جو ہمیں اس سے روک رکھتی ہے۔

۴۔ اجتماعی یا قومی و ملی وجود

اوپر کے تینوں پہلو، معاشرے میں ساتھ ساتھ رہنے والے لوگوں کے گھر کی سطح پر یا محض انسان ہونے کے تعلق
کے لحاظ سے تھے۔ اب ہم گھر سے باہر اجتماعی اور سماجی سطح پر اس کا جائزہ لیں گے کہ گمانوں کی ستم گریاں کیا ہیں۔
اگر ہماری تربیت گھر کے اندر گمانوں کی کثرت میں بچپن کی ہوئی ہو اور ہم اسی کے عادی ہوں، تو یہی چیز ہماری
معاشرت میں بھی نظر آئے گی۔ دفتر، تنظیم، معاشرہ اور ریاست ہر سطح پر یہ چیز اپنے اثرات ڈالے گی۔ کہیں کوئی اپنے
سربراہ کے بارے میں برے خیالات بن رہا ہوگا اور کہیں کوئی اپنے ساتھی کے کسی رویے پر کڑھ رہا ہوگا، اور کہیں کوئی
انتقامی کارروائی کا سوچ رہا ہوگا۔ کوئی انھی خیالات سے ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوگا اور کسی کا موڈ بن رہا ہوگا۔
کوئی بات بات پر گرم ہو جاتا ہوگا اور کوئی کھانے کو آتا ہوگا۔ اس سب کچھ کی وجوہات میں ایک وجہ وہ آرا اور تجربے
ہیں جن کی بنیاد محض گمان ہوتے ہیں۔

جس قوم کے گھر اور دفتر میں یہ حالات ہوں، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ صحت مند طریقے کے ساتھ
دنیا میں چل سکے۔ وہ ہر قدم پر فساد کا شکار ہوگی۔ اس کا اتحاد ہر وقت معرض خطر میں ہوگا۔ اس کی سیاست، مذہب اور
معاشرت میں اتفاق و اتحاد کی ہزار کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ اتحاد کے لیے سب سے پہلی چیز ایک
دوسرے پر اعتماد اور ان کی غلطیوں کو محض غلطی مان کر ساتھ چلنا ہے۔

۵۔ تکریم

عزت و تکریم کے معنی محض یہ نہیں ہیں کہ ہم بڑوں کی عزت کریں، بلکہ انسان کی تکریم یہ ہے کہ اس کے وجود کو

تسلیم کیا جائے، اس کے انسان ہونے کے ناطے اس کی عزت کی جائے۔ سوءظن کی عادت اس تکریم آدمیت سے روکتی ہے۔ سوءظن خطا کار کو شیطان کا روپ دے دیتی ہے، جس سے غلطی کرنے والا ہماری نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر جاتا ہے۔ یہی عمل ہم اپنے سوءظن کی بنا پر دوسروں سے کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہمارے ساتھ۔ جس معاشرے کے افراد میں گمان کرنے کا وصف ہوگا، اس میں ایک دوسرے کی تکریم، احترام، عزت اور بالآخر لحاظ اور پاس خاطر جاتا رہے گا۔ چنانچہ کسی شخص کو اس کا جائز مقام نہ مل سکے گا۔ بہو بیٹیاں اور ساس اسی اژدھے کی ڈسی ہوئی ہیں۔ افسروں ماتحت اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سب کی نگاہوں میں سب ذلیل ہیں۔ عزت صرف دکھاوے کی رہ گئی ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com